بسم الله الرحمن الرحيم

دعائے امام زمانہ علیہ السلام

اللّٰهُمَّ كُنْ لِوَلِيِّكَ الْحُجَّةِ بْنِ الْحَسَنِ صَلَوَاتُكَ

عَلَيْهِ وَعَلَىٰ آبَائِهِ فِي هٰذِهِ السَّاعَةِ وَفِي كُلِّ

سَاعَةٍ وَلِيًّا وَحَافِظًا وَقَائِدًا وَنَاصِرًا وَدَلِيلًا

وَعَيْنًا حَتَّىٰ تُسْكِنَهُ أَرْضَكَ طَوْعًا وَتُمَتِّعَهُ فِيهَا طَوِيلًا

الحادی نظریات اور

ان کے جوابات

المہدی(عج) ادارۂ تربیت اسلامی آئی ایس او پاکستان

فہرست

مقدمہ ۵
برہانِ اسلامیہ در جواب افکارِ الحادیہ ۶
اسبابِ الحاد ۷
الحاد کا تاریخچہ ۷
الحاد جدید یا اِلحاد نو (Neo Atheism) ۸
نفی وجود خدا پر دلائل ۸
پہلی دلیل: مسئلہ شر ۸
دوسری دلیل: خُدا کا مخفی ہونا (divine hiddenness) ۱۶
تیسری دلیل: مبہم اور مخلط وحی (Confused and Erroneous Revelation) اور مذہبی اخلاقیات پر سوال ۱۷
چوتھی دلیل: منطقی استدلالات ۲۱
پانچویں دلیل: خدا کو کس نے بنایا (Who Created God) ۲۳
چھٹی دلیل: شگاف کا خدا (God of the Gaps) ۲۴
باب دوم: سائنس اور اِلحاد ۲۵
فصل: فلسفۂ سائنس (The Philosophy of Science) ۲۵
باب سوم: ارتقاء اور الحاد ۲۸

❁ --- ❁ --- ❁

مقدمہ

علم کلام کی اصطلاح میں کسی بھی راہ راست سے واپسی کو الحاد کہا جاتا ہے، جو شخص راہ راست سے لوٹ کر گمراہی میں پڑ جاتا ہے اسے ملحد کہا جاتا ہے۔ الحاد کو عام طور پر دو معنوں میں استعمال کیا جاتا ہے۔

خاص معنی

خدائے واحد کے وجود کا انکار کرنے کے ساتھ ساتھ اسلام سے منہ موڑنا۔ یہ الحاد کا خاص اور معروف معنی ہے، ایک ایسے خدا کا انکار جس کا وجود توحیدی مذاہب کے مطابق یقینی ہے۔ اس بنیاد پر ملحد وہ ہے جو ایک خدا کے وجود پر یقین نہیں رکھتا۔ اس لیے ملحد کو دہری سمجھا جاتا ہے جو قدرتی واقعات کو دہر سے منسوب کرتے ہیں اور دہر و زمانے کو خدائے واحد اور احد کی جگہ ایک ازلی اور ابدی مبدا کے طور پر تسلیم کرتے ہیں۔ شرک اور ایک سے زیادہ خدا کو ماننا بھی واحد خدا کے وجود سے انکار کے معنی میں الحاد سمجھا جاتا ہے۔ الحاد، اپنے خاص معنی میں، اسلام کی نافرمانی اور کفر کے معنی میں بھی ہے۔ اس نقطہ نظر سے الحاد تقریباً کفر کا مترادف ہے۔ نیز، اس معنی الحاد میں ارتداد بھی شامل ہے، مرتد، یعنی اسلام سے روگردانی کرنے والا مسلمان بھی ملحد سمجھا جاتا ہے۔

عام معنی

اسلام کے کسی بھی بنیادی عقیدہ سے انحراف، راہ راست سے پھر جانا یا گمراہی میں پڑنا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی خدائے واحد کے وجود پر یقین رکھتا ہے، لیکن اسلام کے بنیادی اصولوں میں سے کسی کا انکار کرتا ہے، یا اسلام میں قبول کردہ کسی بھی عقیدے یا رائے کا انکار اور رد کرتا ہے، تو اسے ملحد کہا جائے گا۔ اس نقطہ نظر سے، اگر کوئی خدا کے وجود کو مانتا ہے لیکن اس کے وسیع علم یا قدرت کو نہیں مانتا، یا اسے دنیا کا خالق نہیں مانتا، یا اسے عادل نہیں سمجھتا، تو اسے ملحد سمجھا جاتا ہے۔

عام طور پر الحاد سے اس کا پہلا اور خاص معنی مراد لیا جاتا ہے اور عام لوگ حتیٰ کہ خواص بھی الحاد سے جو کچھ سمجھتے ہیں وہ خدا کے وجود کا انکار ہی ہے۔

برہانِ اسلامیہ در جواب افکارِ الحادیہ

اس آرٹیکل کا بنیادی ہدف ملحدین کے اہم اعتراضات اور نظریات کو بیان کرنا اور ان کے جواب دینا ہے، فلسفی اور عقلی بنیاد پر، نہ کہ روایتی اور نقلی علوم کی بنیاد پر۔ ملحدین کے اہم اعتراضات کو ان اقسام میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:

١۔ فلسفی اعتراضات

٢- سائنسی اعتراضات

٣۔ اخلاقی اعتراضات

فلسفی اعتراضات میں ملحدین خُدا کے وجود میں مسائل پیش کرتے ہیں، جیسے مسئلہ شَر (The Problem of evil)، بکل شیء علیم کا تناقض (omniscience paradox)، ہر جگہ موجود ہونے کا تناقض (omnipresence paradox) یا پھر علی قل شیءٍ قدیر کا تناقض (omnipresence paradox) وران سب کا ایک ہی ذات میں موجود ہونے کا تضاد

سائنسی اعتراضات میں مُلحد سائنس کے تجربی نتائج کو لا کر کہتے ہیں کہ فلاں مذہبی کتاب کی فلاں عبارت سائنس سے ٹکراتی ہے۔ اِن شاء اللہ آپ فلسفہ سائنس کی بحث میں دیکھیں گے کہ سائنس اٹل حقائق نہیں دیتی اس کو مطلق اور کلی معیار نہیں بنایا جاسکتا حق و باطل کو پرکھنے کا۔ اور ساتھ ہی مذہبی زبان کو سائنسی زبان سے نہیں جوڑا جاسکتا کیونکہ دونوں کی نوع مختلف ہے۔

اخلاقی اعتراضات میں ملحدین کہتے ہیں کہ مذہب شر ہے اور غیر اخلاقی باتوں کی تعلیم دیتا ہے جس کے سبب مذہبی افراد شریر کام کرتے ہیں وہ بھی اس کو مقدس اور نیک سمجھ کر اپنے مذہب اور خدا کے نام پر۔

اسبابِ الحاد

یہ ایک پورا پروسیس ہوتا ہے جس سے انسان گذرتا ہے اور کچھ مدت بعد وہ احساس کرتا ہے کہ اب میں کسی بھی خُدا کا قائل نہیں رہا۔ ممکن ہے کچھ لوگ کہیں کہ اس کی وجہ مذہبی بدعات یا رسومات ہیں۔

خود اسلام، قرآن یا اللہ کے بارے میں شبہات آنے سے انسان اسلام سے دست بردار ہوجاتا ہے۔

اکثر وجوہات جذباتی اور اموشنل ہوتی ہیں جس کی منطقی اور عقلی توجیہات بعد میں کی جاتی ہیں کیونکہ کوئی یہ نہیں کہے گا کہ میں نے اموشنل وجوہات کے سبب مذہب کو ترک کیا ہے۔ حالانکہ علم نفسیات اس امر کی تائید کرتا ہے کہ ہمارے اکثر فیصلے پہلے جذبات کی بناء پر ہوتے ہیں جن کے بعد ہم ان کو منطقی وجوہات کی ڈھال دیتے ہیں خود کو اور دوسروں کو قانع کرنے کے لیے۔ ایک وجہ ما بعد الاستعمار (post-colonialism) اور مغرب کے سامنے احساس کمتری ہے کہ مغرب ترقی کر رہا ہے تو اس کا مطلب ہے ان کی نظریاتی اساس بھی حق ہے۔ ایک اور وجہ سیاسی اور مذہبی رہنماؤں سے بھروسہ اٹھ جانا بھی ہے، جس کے نتیجے میں خود اسلام سے اعتماد و اعتقاد اُٹھ جاتا ہے۔ تیسری وجہ لبرلزم ہے۔

اکثر مولوی ڈانٹ ڈپٹ کے سوا کچھ نہیں کر پاتے جب ان سے مشکل سوال پوچھا جاتا ہے خدا کے بارے میں یا شرعی امور کے بارے میں جن میں غلامی، مسئلہ ارتداد وغیرہ شامل ہیں، اور نہ ان میں ظرفیت یا استطاعت ہے اس قسم کے پیچیدہ موضوع پر بات کرنے کی جس قسم کے سوالات ملحدین اٹھاتے ہیں۔ نہ ان میں سے بہت سوں نے سائنس پڑھی ہوتی ہے نہ فلسفہ، تو ان کے ہاتھ میں ڈانٹ کر کفر کے فتوے لگا کر چپ کرانا ہی رہ جاتا ہے۔ لیکن اس سے اس لڑکے یا لڑکی کے ذہن میں جو سوال ہے وہ تو وہیں کا وہیں رہے گا بلکہ وہ شک کا بیج جو بو دیا گیا وہ بڑھتا جائے گا اور الحاد کا درخت اس کے قلب میں اُگ آئے گا۔

ایک اور سبب خواہشات کی اتباع ہے۔ جب انسان خواہشات کا اسیر ہو جاتا ہے، تو وہ اس کو گمراہی تک لے جاتی ہیں۔ بہت سے لوگوں کی گمراہی کی وجہ ان کی خواہشات ہی ہوتی ہیں، اور پھر چونکہ اسلام ان کی خواہشات کے مطابق نہیں ہوتا تو وہ اس کو ترک کر دیتے ہیں۔ اسلام میں فلاں حکم کیوں ہے؟ فلاں بات مجھے پسند نہیں ہے۔ اسلام زناء کی سزا اتنی سخت کیوں رکھتا ہے، یہ میری خواہش کے خلاف ہے۔ جس کو وہ ''انسانی حقوق'' کے خلاف ہونے کا لبادہ اوڑھا دیتے ہیں۔

الحاد کا تاریخچہ

سب سے پہلا ملحد تب سے ہی موجود رہا ہے جب سے خُدا پرست رہا ہے، کیونکہ ہر چیز کے ردعمل میں دوسری چیز بھی وجود میں آ ہی جاتی ہے۔

لفظ الحاد آیا ہے لحد سے جو کہ قبر سے انحراف کا نام ہے اور اسی لیے الحاد کو حق سے انحراف کے طور پر سمجھا گیا ہے۔ قرآن فرماتا ہے:

وَ قَالُوْا مَا هِیَ اِلَّا حَیَاتُنَا الدُّنْیَا نَمُوْتُ وَ نَحْیَا وَ مَا یُهْلِكُنَاۤ اِلَّا الدَّهْرُ

''اور انہوں نے کہا کہ ہماری بس یہی دنیوی زندگی ہے، ہم مرتے ہیں اور جیتے ہیں اور ہمیں بس وہر ہی ہلاک کر دیتا ہے۔۔۔'' (الجاثیہ: ۲۴)

اس کے بعد اٹھارویں اور انیسویں صدی میں بہت سے فلاسفہ نے خدا کا انکار کیا اور اس کے خلاف اپنے دلائل پیش کیئے۔ اس میں مشہور نام ''نطشے'' Friedrich Nietzsche ہے جس نے کہا کہ خُدا مر چکا ہے۔ اس دور میں حکومتی سطح پر بھی الحاد کو رائج کیا گیا جیسے روس اور چین میں جس کے سبب بہت سے افراد کو جبراً مُلحد بنایا گیا۔

الحاد جدید یا اِلحاد نو (Neo Atheism)

ہمارے زمانے میں الحاد کی ایک خاص قسم بنام (الحاد جدید) وجود میں آئی ہے جس کا زور سائنس پر ہے مذہب کے متبادل ، اور مذہبی اخلاقیت کے متبادل Liberalism اور Humanism اور حکومتی سطح پر Secularism لانے کو مذہب کی بجائے لانے کا نظریہ ہے۔ اکثر ملحدین جو آج موجود ہیں وہ اس طرح کے الحاد کو ہی مانتے ہیں۔

نفی وجود خدا پر دلائل

پہلی دلیل: مسئلہ شر

جب سے انسان کے پاس تدبر و تفکر کی قوت ہے، تب سے اس کے ذہن میں یہ سوال رہا ہے کہ دنیا میں بُرائی اور شر کیوں ہے، اور ہم پر آفات و بلائیں اور مصیبتیں کیوں آتی ہیں۔ اگر ایک سراپا اچھائی کا خُدا موجود ہے، تو وہ بُرائی کو کیوں ہونے دیتا ہے؟ اس نے بُرائی کو آخر بنایا ہی کیوں ، کیا یہ ایک اچھے خدا کو زیب دیتا ہے؟ یہ سب اہم سوالات ہیں جو ہر متدبر انسان کے ذہن میں زندگی میں کبھی نہ کبھی آتے ہی ہیں۔ اس امر کو ہم مسئلہ شر یا the problem of evil کا نام دیتے ہیں۔

ملحدین کے اس استدلال کو اگر ہم منطقی ترتیب دیں تو یوں ہوگی:

۱۔ خدا موجود ہے اور ہر چیز پر قادر، سراپا خیر ہے اور ہر چیز کا جاننے والا ہے۔

۲۔ خُدا اگر سب کچھ جانتا ہے تو وہ جانتا ہے کہ کن احوال میں شر وجود میں آئے گا۔

۳۔ خدا اگر ہر چیز پر قادر ہے تو وہ شر کو وجود میں آنے سے روک سکتا ہے۔

۴۔ خدا چونکہ سراپا خیر ہے پس وہ شر کو وجود میں آنے سے روکے گا۔

۵۔ لہٰذا، شر موجود نہیں ہے۔

لیکن شر وجود رکھتا ہے، تو یہاں تضاد آ گیا۔ لہٰذا، ایسا خدا موجود نہیں ہے جو ہر چیز پر قادر ہو، سب جانتا ہو اور سراپا خیر ہو۔

اپیکرس کے سوالات

کیا خدا شر کو روکنا چاہتا ہے، مگر روک نہیں سکتا؟ پھر وہ علی کل شیٍٔ قدیر (ہر چیز پر قادر) نہیں ہے۔

کیا وہ روک سکتا ہے، مگر روکنا نہیں چاہتا پھر وہ شقی ہے۔

کیا وہ روکنا بھی چاہتا ہے اور روک بھی سکتا ہے؟ پھر شر کہاں سے آ گیا؟

کیا وہ نہ روک سکتا ہے اور نہ روکنا چاہتا ہے؟ پھر اس کو خدا کیوں کہا جائے؟

اس اَمر کا تعلق کسی حد تک قضاء و مدیر اجلاء و مصائب سے بھی ہے۔

جواب: اگر کہا جائے کہ ایک آئیڈیل ورلڈ (ideal world) ہے جو سب سے کامل جہان ہے جو وجود رکھ سکتا ہے تو یہ عالم، ذہنی وجود رکھتا ہے اور اس کے وجود میں کوئی تبدیلی نہیں آتی کیونکہ یہ خارجی وجود نہیں رکھتا بلکہ ذہنی وجود ہی رکھتا ہے۔ لیکن حقیقی دنیا تو ہر وقت حرکت اور تغیر میں ہے، تو جب یہ آئیڈیل ورلڈ حقیقی دنیا میں متحقق ہوگا تو بالآخر اس میں بھی تبدیلی آئے گی۔ اور جب اس میں تبدیلی واقع ہوگی تو یہ سب سے افضل صورت سے نچلے درجے میں لامحالہ جائے گا جس حالت کو ہم شر کہیں گے۔ لہٰذا عالم مادّہ میں اپنے وجودی ضعف کے سبب شر لازم ہو جائے گا کیونکہ جو ذہنی و خیالی عالم وجود رکھتا ہوگا جو سب سے افضل ہوگا، اس سے افضل تو ممکن ہی نہیں ہے لیکن جب وہ متحقق ہوگا تو پھر وہ اپنی اس کیفیت سے افضل کیفیت میں جا ہی نہیں سکتا کیونکہ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ جو عالم ہم نے تصور کیا تھا وہ سب سے افضل تھا ہی نہیں کیونکہ اس سے افضل ممکن تھا۔ پس معلوم ہوا کہ عالم مادہ اکملیت پر فائز ہو ہی نہیں سکتا البتہ وہ اپنے اس وجودی ضعف کے باوجود اپنے مقام اور خُدا سے اپنی دوری کے حساب سے اپنی اکمل صورت میں ہے اور اس میں جو نقص ہے وہ اس کی دوری کے سبب ہے، اور اس کمال سے دوری کا نام نقص ہے۔

کچھ معترضین تکوینی اور تشریعی شر کو ملا دیتے ہیں

تکوینی شر کا وجود نہیں ہے، اور یہ دنیا سب سے بہترین صورت میں ہے جو وہ ہو سکتی تھی۔ تشریعی شر موجود تو ہے۔لیکن اس کی نسبت خدا سے نہیں بلکہ لوگوں کی طرف ہے چونکہ لوگوں نے اسے اپنے ارادے و اختیار سے (اگرچہ یہ ارادہ کی قوت خدادادی ہے اشعری نظریہ کے برخلاف) انجام دیا ہے۔اس لیے تشریعی شر کی نسبت خود لوگوں ہی کی طرف ہے۔

عموما شر کو دو اقسام میں منقسم کیا جاتا ہے : اخلاقی شر، وہ جو کوئی باشعور جاندار کے ذریعے (جیسے قتل) وجود میں آتا ہے اور طبعی شر، وہ جو لاشعور وقائع وعوامل کے سبب حادث ہوتا ہے جیسے قدرتی آفات، زلزلے وغیرہ۔ جہاں تک اخلاقی شرور کی بات ہے،تو ان کا الزام خُدا پر نہیں ڈالا جا سکتا کیونکہ خدا نے انسان کو مختار بنایا ہے کہ وہ اپنے انفعال خود چن سکے، پس اس کا مسؤول بھی انسان ہی ہے اگر وہ کوئی برائی انجام دے۔اور جہاں تک طبعی شرور کی بات ہے،تو وہ بھی خدا پر نہیں ڈالے جا سکتے کیونکہ وہ دنیا کے طبعی نظام کا حصہ ہیں، ایسے ہی ہماریاں بھی زندگی کی موجودگی کا ایک لازمہ ہیں، ہاں کوئی یہ ضرور کہہ سکتا ہے کہ نیچرل دنیا میں خدا نے ان چیزوں کو پیدا کیا ہے، مگر ضروری نہیں کہ ان کو شر کا نام دیا جائے، کیونکہ یہ فقط نسبی (subjective) طور پر شر ہیں، ان کو موضوعی (objective) طور پر شر ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ نیز ان نسبی مصائب وآفات کو ٹالنے کی بھی قدرت ہمیں خدا کی طرف سے عطاء کی گئی ہے، اگر ہم اسکا ستعمال نہ کریں تو ادھر بھی ذمہ دار خود انسان ہے اپنی مصیبت کا۔

کچھ نے یہ دفاع کیا کہ اگر شر نہ ہو،تو آزادی اختیار کے متضاد ہو جائے گا۔اعمال میں آزادی کے لیے ہمارا بُرے اعمال کرنے میں آزاد ہونا بھی منطقی طور پر ضروری ہے۔اگر میں بُرے اعمال کرنے میں آزاد نہیں ہوں تو میں اس امر میں مجبور ہوں، پس میرے پاس اپنے افعال میں ذاتی آزادی نہیں ہے۔اور ایک ایسی دنیا جس میں محض روبوٹ ہوں جو بس اچھائی پر عمل کریں، ہماری موجودہ دنیا سے بہتر نہیں ہے جس میں خود مختار انسان ہیں جو اپنے افعال کا انتخاب کر سکتے ہیں۔

ہاں، اگر سوال ہو کہ خود خُدا کیوں مداخلت نہیں کرتا جب کوئی بُرائی دنیا میں ہوتی ہے، تو اس میں بھی انسان کا فاعل مختیر ہونے کی نفی ہے، کیونکہ پھر انسان کو موقع نہیں ملے گا اس بُرائی کے سد باب میں کچھ کرنے کا۔ ایک نقطہ یہ بھی ہے کہ خُدا مداخلت کرتا ہے، مگر ضروری وقت پر، چونکہ اس کا علم انسان کے علم سے زیادہ کامل ہے، تو اس کو پتا ہے کسی وقت پر اور کس موقع پر مداخلت کی جائے، جیسا کہ ایک والد کو پتا ہوتا ہے کہ کب بچوں کی لڑائی میں اس کو مداخلت کر کے روکنا ہے اور کن مراحل پر مداخلت نہیں کرنی، پس ہم اپنے محدود علم کے سبب پوری تصویر کو ایسے نہیں دیکھ سکتے جیسے خُدا اس کو دیکھ سکتا ہے اور ایک جزء کو دیکھ کر کل پر حکم نہیں لگا سکتے۔

کچھ، مثلاً سینٹ آگسٹین (متوفی 430 عیسوی) ابن سینا وغیرہ نے شر کے وجود کی نفی کی ہے اور کہا ہے کہ یہ ایک امر عدی ہے، جو کہ خیر کے انعدام وغیر موجودگی کا نام ہے۔ پس اس تھیوری کے تحت شر کوئی وجود ہی نہیں رکھتا، فقط یک عدم اور فقدان کا نام ہے، جیسا کہ علم ایک حقیقت رکھتا ہے، اور جہالت فقط علم کا عدم۔ جہالت بذات خود کوئی وجود نہیں رکھتا یہی معاملہ اطاعت کا ہے، جہاں اطاعت کا ہو وہاں سے معصیت زائل ہو جاتی ہے، اور جہاں اطاعت نہ ہو یعنی اس کا فقدان ہو وہاں معصیت اس کی جگہ لے لیتی ہے۔ پس، شر کوئی شی ءنہیں ہے۔ لغوی اعتبار سے بھی شر، خیر کی ضد ہے، جیسا کہ الکافی میں مشہور ''حدیث جنود'' میں بھی آیا ہے:

مّا أعطَى العَقلَ مِن الخَمسَةِ و السَّبعينَ الجُندِ : الخَيرُ وَ هُو وَزيرُ العَقلِ، و جَعَلَ ضِدَّهُ الشَّرَّ و هُو وَزيرُ الجَهلِ

امام صادق علیہ السلام نے فرمایا: اللہ نے عقل کو 75 لشکر دیئے، خیر (اچھائی)، وہ عقل کی وزیر ہے، اور اللہ نے شر (برائی) کو اچھائی کا متضاد بنایا ہے اور وہ جہالت کا وزیر ہے۔)

(الکافی، ج ۱، ص ۲۱)

نطشے اور دیگر مغربی فلاسفہ نے یہ مانا ہے کہ شر (اور خیر) جیسی کوئی چیز وجود نہیں رکھتی۔ اگر ہم ارتقائی و معاشرتی لحاظ سے دیکھیں تو شر و خیر معاشرتی ساخت معلوم ہوتے ہیں۔ کہ جو چیز انسان

کے ذاتی اہداف ومقاصد کے خلاف ہو، اوراس کو بری لگے، وہ اس کو شر کا نام دے دیتا ہے، مگر کیا ہم اتنی اہمیت کے حامل ہیں کہ ہم اپنی پسند نہ پسند سے کائناتی حقائق پر عنوان لگائیں اور کسی چیز کو مطلقاً شر قرار دیں؟

ارتقائی لحاظ سے، جو چیز ہماری بقاء وتولید میں کارآمد ہو وہ خیر ہے، جبکہ جو اس میں رکاوٹ ڈالے وہ شر قرار پاتا ہے۔ یہ خود ارتقائی مراحل کے سبب ہے، اور کسی بات کی حقانیت پر اثر نہیں کرتا۔ ہمارے احساسات وجذبات بھی کسی چیز کی حقانیت پر اثر نہیں کرتے۔ (جیسے بچھو کا ڈنگ)

اگر کوئی اعتراض کرے: شر کو خیر کا عدم کہنے کی بجائے، خیر کو شر کا عدم کہہ کر، وجود کو شر کا عدم کیوں نہیں کہا جاسکتا؟ اولاً تو ہم اس بات کا اثبات کر چکے ہیں کہ وجود ہی خیر ہے کیونکہ وجود میں نظم ہے اور کسی جہت سے وجودی ضعف کے سبب ہی بے نظمی پیدا ہوتی ہے جو کہ شر ہے، لیکن اگر فرض کرلیا جائے کہ وجود ہی شر ہے، تب ہم کہتے ہیں: یہ مادی کائنات خُدا سے وجودی اعتبار سے سب سے دور ہے، اور اس لحاظ سے یہ وجودی ضعف رکھتی ہے، لہٰذا یہ کائنات سب سے (کم شر رکھتی ہے اور سب سے زیادہ خیر رکھتی ہے کیونکہ وجود تو شر ہے، اور شر کا عدم خیر ہے، اور کائنات سب سے کم وجود رکھنے) کی وجہ سے سب سے زیادہ خیر ہے۔ لہٰذا مسئلہ شر پھر بھی حل ہوگیا کیونکہ اس کا معنی یہ ہوا کہ یہ کائنات سب سے کم شر ہے، اس سے بہتر کائنات ممکن نہیں لہٰذا یہ بہترین عالم ہوا۔ (یہ جواب یا دلیل نقضی ہے جو کہ ہم نے دلیل حلی کے ساتھ فراہم کی ہے۔

ظاہر یہی ہوتا ہے کہ شر ایک نسبی چیز ہے، جو معاشرتی، جذباتی (اموشنل) اور دیگر عوامل کے سبب ہم بعض چیزوں کا نام رکھ دیتے ہیں۔ ممکن ہے ہمیں کوئی چیز شر لگے مگر وہ درحقیقت شر نہ ہوگا، جیسا کہ قرآن میں ارشاد باری تعالی ہے:

وَعَسَى أَن تَكْرَهُوا شَيْئًا وَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَعَسَى أَن تُحِبُّوا شَيْئًا وَهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ وَاللهُ يَعْلَمُ وَأَنتُمْ لَا تَعْلَمُونَ

"ممکن ہے تمہیں کوئی چیز ناپسند ہو مگر اور تمہارے لیے اچھی ہو، اور ممکن ہے تمہیں کوئی چیز

پسند ہومگر وہ تمہارے لیے بُری ہو، اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔‘‘(البقرہ:۲۱۶)

وَعَسٰى أَن تَكْرَهُوا شَيْئًا وَيَجْعَلَ اللّٰهُ فِيهِ خَيْرًا كَثِيرًا

’’۔۔۔ممکن ہے تمہیں کوئی چیز نا پسند ہو مگر اللہ نے اس میں بہت اچھائی رکھی ہو۔‘‘(النساء:۱۹)

بہت سی برائیاں دنیا میں لوگوں کے اپنے کاموں کی وجہ سے ہیں، اوراس میں ماحولاتی نظام پراثر بھی انسانوں کی وجہ سے ہے جس سے پھر ہمیں ہی ضرر پہنچتا ہے، اس پر ارشاد باری تعالی ہے:

ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي النَّاسِ لِيُذِيقَهُم بَعْضَ الَّذِي عَمِلُوا لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ

زمین اور سمندر پر فساد ظاہر ہوا ہے اس وجہ سے جو لوگوں نے اپنے ہاتھوں سے کمایا ہے، تاکہ خدا ان کو اس میں سے کچھ چکھا دے جو انہوں نے کیا ہے، تاکہ شاید وہ واپس لوٹ آئیں۔(الروم:۴۱)

شرایک وجودی ontological نہیں بلکہ مظہری phenomenological شیء ہے جس کو تجربہ کیا جاتا ہے۔

شر دنیا میں موجود نہیں ہے، یہ بس خیر کا عدم ہے یعنی امر علامی ہے اور عدم فی نفسہ وجود ہی نہیں رکھتا، مگر دنیا میں مصائب اور suffering ضرور وجود رکھتی ہے۔ضروری نہیں ہم ان کو شر کا نام دیں، کیونکہ خدا سے شر صادر نہیں ہوتا، کیونکہ خُدا شریر نہیں ہے۔لہٰذا شر ایک عدمی کیفیت ہے جو کبھی متحقق نہیں ہوتی دنیا میں، آزمائشیں و مصیبتیں ہوتی ہیں، مگر اس کو شر قرار دینا فقط معاشرتی، ارتقائی، احساساتی وجذباتی اور دیگر وجوہ کے سبب ہے۔

البتہ نسبی طور پر کوئی کہہ سکتا ہے کہ اس کے لیے کوئی چیز شر ہے، مگر پھر وہی چیز کسی اور شخص کے لیے خیر اور اچھائی ہو سکتی ہے، جیسے ڈالر کا ریٹ بڑھے تو ایک فرد نسبی طور اس کو شر قرار دے گا جبکہ کسی دوسرے کے لیے وہی واقعیت (ڈالر کا ریٹ بڑھنا) ایک اچھائی ہو سکتی ہے۔

پس خلاصہ بحث یہ ہے کہ شر تکوینی اصلاً وجود نہیں رکھتا، اس لئے اس کی نسبت خدا کی طرف نہیں دی جاسکتی، کیونکہ یہ Best of all Possible Worlds ہے، جس کو ہم کہتے ہیں:

لیس فی الإمکان أبدع مما کان

یعنی جو کچھ ہے اس سے بہتر ممکن نہیں تھا۔ ہاں شر تشریعی یا نسبی و اخلاقی ضرور ہے، لیکن اس کی نسبت خُدا سے نہیں بلکہ مخلوقات سے ہے۔ اس لیے یہ مسئلہ شر خدا کے عدم یا۔۔۔ پر دلیل نہیں ہوسکتا۔

شہید مطہریؒ اس مطلب کی توضیح اس طرح دیتے ہیں:

''شر عدم ہے'' کہنے والے حضرات کا یہ مقصد ہرگز نہیں کہ جس چیز کو ہم شر کے نام سے پہچانتے ہیں ہے وہ وجود ہی نہیں رکھتی۔

کیونکہ ایسا کہنا خلاف عقل ہے۔ ہم بچشم خود دیکھ رہے ہیں کہ بینائی وسماعت سے محرومی، بیماری ظلم وستم جہالت، ضعف، موت اور زلزلہ وغیرہ یہ تمام اشیاء وجود رکھتی ہیں۔ نہ ان کے وجود کا انکار کیا جاسکتا ہے اور نہ ہی ان کے شر ہونے کا، یہ بھی نہیں کہا جاسکتا کہ شر عدمی ہے اس لئے سرے سے موجود ہی نہیں رکھتا۔ لہٰذا بروں اور برائی سے مقابلہ نیز نیکی کا حصول اور نیک افراد کی تائید انسان کی ذمہ داری ہی نہیں ہے۔

بحث کا محور یہ ہے کہ یہ تمام اشیاء ''عدمیات'' اور ''فقدانیات'' سے تعلق رکھتی ہیں، ان کا وجود ہمیں ایک طرح کے نقص اور خلاء کا احساس دلاتا ہے۔ اب ان اشیاء کا ''شر'' ہونا یا تو اس بناء پر ہے کہ یہ نابودی، ہلاکت، کمی اور خلاء کے مساوی ہیں یا نابودی، ہلاکت، کمی، اور خلاء کا سبب ہیں اس لئے ''شر'' ہیں۔

بدی اور خوبی ایک دوسرے میں مدغم اور مخلوط ہیں۔ ان میں انفکاک اور علیحدگی قابل تصور نہیں۔ عالم طبیعت میں جہاں خوبی ہے وہاں بدی بھی ہے اور جہاں بدی ہے وہاں خوبی بھی

ہے، عالم طبیعت میں یہ دونوں ایک مرکب آمیزے کی مانند ہیں۔

عالم طبیعت کہ جہاں قوۃ وفعل، حرکت وتکامل اور تضاد وتزاحم ہے وہیں پر وجودات کے ساتھ ساتھ اشیاء پر عدم کا عنوان بھی صادق آجاتا ہے۔ جب ہم نابینائی کی بات کرتے ہیں تو ہمیں یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ نابینائی، نابینا انسان کی آنکھوں میں موجود کوئی با قاعدہ اور قابل احساس حقیقت ہے، جی نہیں، نابینائی اس بینائی کا فقدان اور عدم ہے، نیز بجائے خود کوئی با قاعدہ مستقل حقیقت نہیں۔

خوبی و بدی بھی ہستی اور نیستی کی مانند ہیں بلکہ خوبی ہو بہو ہستی ہی ہے اور بدی نیستی۔ کسی بھی بدی کا ذکر درحقیقت ایک نیستی وفقدان کا ذکر ہے۔ بدی یا تو خود نیستی اور عدم سے ہے یا ایسی ہستی ہے جو ایک طرح کی نیستی کا لازمہ ہے۔ یعنی بدی ایسا موجود ہے جو خود اپنی ذات کے لئے اس لحاظ سے کہ وہ خود ایک ذات ہے اچھائی اور خوبی ہے لیکن اس لحاظ سے کہ ایک نیستی کا لازمہ ہے، بد ہے کسی اور لحاظ سے بد نہیں۔ ہم نادانی، غربت، اور موت کو برا جانتے ہیں یہ تمام مقولے نیستی اور عدم ہیں۔ زہریلے جانور، درندے، جراثیم اور آفات کو بد مانتے ہیں یہ تمام موجودات اپنی ذات کے لحاظ سے عدم نہیں ہیں بلکہ ایسے وجود ہیں جن کا لازمہ (دوسرے کے لئے) نیستی اور عدم ہے۔

نادانی علم کا فقدان اور عدم علم ہے۔ علم ایک حقیقت اور کمال حقیقی ہے۔ لیکن جہل و نادانی حقیقت نہیں رکھتے۔ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ ''نادان، فاقد علم'' ہے یا ''نادان علم، سے محروم ہے'' تو اس کے معنی یہ ہیں کہ نادان شخص فقدان علم نام کی ایسی صفت سے متصف ہے جس سے عالم ودانشور منصف نہیں۔

موت بھی کسی چیز کو کھو دینے کا نام ہے کسی چیز کو حاصل کر لینے کا نہیں۔

لیکن زہریلے جانور درندے جرائم سیلاب زلزلے اور آفات کیونکہ موت یا نقص عضو ہونے کا باعث ہیں یا چھپی ہوئی استعداد کے نقطہ کمال تک پہنچنے کی راہ میں رکاوٹ، لہٰذا اس لحاظ سے یہ بد ہیں۔ اگر زہریلے کپڑے بیمار یا موت کا باعث نہ بنتے تو ہرگز بد نہ تھے۔ کیڑے اگر درختوں اور

پودوں کی بربادی یا پھلوں کے سڑنے کا سبب نہ ہوتے تو بد نہ تھے۔ اگر سیلاب وزلزلے جانی ومالی نقصان کا سبب واقع نہ ہوتے تو بد نہ تھے۔ بدی اور برائی انہی نقصانات (کمی) اور کسی نہ کسی چیز کے فقدان میں ہی مضمر ہے۔ اگر درندہ بری شئے ہے تو اس کی وجہ یہ نہیں کہ اس کی ماہیت وحقیقت" بد ہے بلکہ اس جہت سے بد ہے کہ یہ درندہ موت اور حیوانات سے سلب حیات کا باعث ہے۔ در حقیقت جو شئے بذات خود بد ہے وہ فقدان حیات ہے۔ اگر درندہ درندگی کا مظاہرہ نہ کرے یعنی کسی سے اس کی زندگی کو نہ چھینے تو ہرگز برا نہیں اور اگر فقدان حیات کا باعث ہو تو برا ہے۔

دوسری دلیل: خُدا کا مخفی ہونا (divine hiddenness)

یہ استدلال کہتا ہے کہ خدا غائب کیوں ہے، اتنے عرصے سے فعال کیوں نہیں ہے؟ یعنی یہ خُدا کی فعالیت پر اشکال ہے کہ اگر وہ واقعی ہے تو اپنا فیل کیوں نہیں دکھاتا جیسے وہ ہزاروں سال پہلے دکھا رہا تھا۔ اور یہ بھی کہ خود خُدا ہمارے سامنے کیوں نہیں آجاتا؟ اور وہ کہتے ہیں کہ اگر خدا ہے تو وہ نہایت رحیم وکریم ہے تو کوئی بھی فرد معقول اسباب کے تحت ملحد نہیں ہوگا، درحالیکہ معقول اسباب کے تحت لوگ ملحد ہوتے ہیں لہٰذا خدا نہیں ہے۔

جواب: خود ہمارا وجود ہونا اس کی دلیل ہے کہ خدا موجود ہے۔

کائنات کی حرکت ہی اس کی فعالیت کی دلیل ہے۔ لیکن اگر وہ دنیوی امور میں تصرف نہ بھی کرے تب بھی یہ اس کے عدم پر دلیل نہیں ہے کیونکہ محض موجودات اور ماہیات کا موجود ہونا ہی اس کے وجود کے لیے کفایت کرتا ہے۔

خدا کو دیکھنے کی خواہش بنی اسرائیل نے بھی کی تھی لیکن قرآن نے ان کا رد کیا، کیونکہ خدا کو آنکھوں سے نہیں دیکھا جاسکتا، آنکھوں میں یہ ظرفیت نہیں کہ خدا کا احاطہ کرسکیں۔

رہی بات کہ خدا مخفی ہے تو حقیقت یہ ہے کہ خُدا سے زیادہ جلی یعنی ظاہر کوئی چیز نہیں مگر وہ اتنا جلی ہے کہ وہ خفی ہے۔ یعنی اس کا وجود اتنی شدت رکھتا ہے اس کی یہ شدت ہی دوری کا باعث بنتی

ہے۔ وہ اتنا نزدیک ہے اور اتنی شدت سے وجود رکھتا ہے کہ اس کی نزدیکی اور شدت ہی اس کے پنہان اور مخفی ہونے کا سبب بنتی ہے۔ مگر وہ ساتھ ہی ظاہر بھی ہے، اس کے مظاہر ہمارے سامنے موجود ہیں اور وہ اس کے ظاہر ہونے پر واضح دلیل ہیں۔

تیسری دلیل: مبہم اور مخلط وحی (Confused and Erroneous Revelation) اور مذہبی اخلاقیات پر سوال

ملحد کہتے ہیں کہ وحی کی زبان بہت مبہم ہے اور اس کو متعدد طرح سے سمجھا جا سکتا ہے (اور اس سے متضاد معانی مراد لیے جا سکتے ہیں) اور بسا اوقات یہ سائنس سے بھی متضاد ہوتی ہے۔ تو ایسے میں ہم اس پر ایمان کیوں رکھیں، جب اس کا پیغام ہی اتنا ناقص ہو؟

بہت سے لوگ سمجھتے ہیں کہ مذہب اور سائنس میں کوئی تضاد ہے یا یہ دونوں ساتھ ساتھ نہیں چل سکتے۔ معروف ملحد رچرڈ ڈاکنز کا بھی یہی موقف ہے جو انٹرنیٹ پر اس کی وڈیوز میں دیکھا جا سکتا ہے۔

مذہبی یا دینی زبان

مذہب آیا ہے ذھب سے یعنی جانا اور مذہب یعنی جانے یا چلنے کا راستہ۔ جبکہ دَین آیا ہے دین یعنی قرضہ سے اور یہ ایک طرح کا قرضہ ہے، اور چونکہ اور دونوں الفاظ کا مادہ ایک ہی ہے۔ پس ہم اللہ کے مقروض ہیں اور اس کو ہمیں دین کے ذریعہ سے اداء کرنا ہے، لہذا دین پورا ضابطہ حیات ہے جو ہمیں خالق سے ملا ہے اور اسی سے ملاتا ہے۔

دینی زبان ہمیں ماورائی عوالم کی خبر دیتی ہے اور عموماً تمثیلی زبان میں پیش کی جاتی ہے تا کہ گہرے مطالب پہنچائے جا سکیں اور کہانیوں کا استعمال کیا جاتا ہے جو اپنے اندر بہت سے درس رکھتی ہیں (انسان ان کو اپنی عملی زندگی میں بھی اپنا سکتا ہے) اسی طرح استعارے، مجاز کو استعمال کیا جاتا ہے۔

سائنسی زبان

کچھ مفروضات کی بناء پر مادی دنیا کا مشاہدہ کر کے کچھ کلیہ اور نظریہ قائم کیے جاتے ہیں ان مشاہدات وتجربات کو جوڑ کر تا کہ ماضی میں ہونے والے مشاہدات سے مستقبل میں ہونے والے مظاہر کی پیشین گوئی کی جائے۔ بنیادی فلسفے ہیں materialism naturalism وغیرہ۔

ہم دیکھتے ہیں کہ دین اور سائنس بالکل ہی الگ زبان استعمال کرتے ہیں حقیقت کو بیان کرنے کے لیے۔ ایک کا تعلق مادی دنیا میں حوادث کو naturalism کے فلسفے کے حساب سے سمجھانا ہے جبکہ دوسرا فقط طبیعی علت ومعلول کو نہیں دیکھتا بلکہ اس سے بڑھ کر سوال پوچھتا ہے جو سائنس کے میدان سے باہر ہیں، جیسے یہ پوچھنا کہ آیا زندگی کا کوئی مقصد ہے، اخلاقیات کیسے طے کی جائے، خُدا ہے یا نہیں، کائنات سے ماوراء کیا ہے؟ وغیرہ۔

ہاں، جو افراد اس تضاد کے قائل ہیں وہ قرآن یا حدیث سے متون لاتے ہیں جن میں ظاہراً قرآن سے ٹاکرا ہے۔ ہم بطور مثال ایک مثال پیش کرتے ہیں جس میں اللہ نے انسان کی خلقت کی بات کی ہے:

خُلِقَ مِنْ مَاءٍ دَافِقٍ (الطارق) يَخْرُجُ مِن بَيْنِ الصُّلْبِ وَالتَّرَائِبِ

(الطارق:۷)

اِس کو اچھلتے پانی سے خلق کیا گیا ہے۔ وہ پیٹھ اور پسلیوں کے درمیان سے نکلتا ہے۔ معترضین گنتے ہیں کہ یہاں منی کی بات ہو رہی ہے، جو پیٹھ اور پسلیوں کے بیچ سے نہیں نکلتی۔ اگر ہم تفاسیر کی طرف جائیں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہاں پیٹھ سے مراد مرد ہے اور پسلیوں سے مراد عورت ہے، جب یہ دونوں ہمبستری کریں تو درمیان سے ہی منی خارج ہوتی ہے جس سے انسان پیدا ہوتا ہے۔

قرآن کا اسلوب یہ ہے کہ وہ euphemism سے کام لیتا ہے بسا اوقات، یعنی جب ایک مفہوم سمجھانے کے لیے زیادہ سخت یا نامناسب الفاظ کی بجائے مناسب الفاظ کا استعمال کیا جاتا ہے، جیسے بطور مثال قرآن نے عورتوں سے ہمبستری کی بات کی تو euphemism کا

استعمال کرتے ہوئے اس کو ''مس'' کہا جیسا کہ متعدد آیات میں تَمَسُّوهُنَّ آیا ہے جس کا مطلب ہے کہ ان عورتوں کو چھوتے ہو یا مس کرتے ہو لیکن اس سے مراد ان سے ہمبستری کرنے کا ہے۔ اس ہی طرح قرآن میں آیا ہے کہ

اخْفِضْ جَنَاحَكَ

یعنی اپنے پر کو نیچے کرو لیکن اس کا سب نے یہی مفہوم لیا ہے کہ تواضع کرو۔

اگر قرآن بلکہ کوئی بھی انسان یا کتاب کہے کہ سورج طلوع کر رہا ہے یا غروب کر رہا ہے تو سائنسدان آ کر یہ اعتراض نہیں کر سکتا کہ سورج تو رات یا دن میں کہیں بھی نہیں جاتا، ہماری زمین ہی گھومتی ہے۔

ایک اور مفروضہ یہ بھی ہے کہ معاصر سائنس حقیقت کو 100 فیصد درست بیان کرتی ہے، جو کہ غلط مفروضہ ہے۔

صرف جو ظاہر پرست (literalist) ہوگا اس کو مذہبی زبان میں مسائل لگیں گے، اور اس مسئلے سے دو چار بہت سے مذہبی متشدد بھی ہو جاتے ہیں اور ساتھ ہی مذہب کے ناقدین بھی اس سے دو چار ہو جاتے ہیں کیونکہ ان کی دال یوں ہی گلتی ہے اور دین پر تنقید کا موقع فراہم ہوتا ہے۔ سارا مسئلہ افراط و تفریط کا ہے یہاں بھی اعتدال و میانہ روی ضروری ہے۔ ایک طرف کچھ لوگ سائنس کو لا کر مذہب اور قرآن ثابت کرنا چاہتے ہیں جبکہ دوسری طرف کچھ لوگ سائنس کا استعمال کر کے دینی کتب کا رد کرنا چاہتے ہیں، ہم دونوں طریقہ کار کو درست نہیں جانتے کیونکہ ایک تو خود سائنس اٹل نہیں ہے اور دوسری بات ہم قرآن کے متن پر اپنی فہم نافذ اور مسلط کرنا چاہ رہے ہیں کہ اس کا حقیقی معنی یہی ہے جو سائنس سے ہم آہنگ/متضاد ہے، لیکن حقیقت تو یہ ہے کہ تدبر کے ذریعہ ایک آیت سے متعدد معانی نکالے جا سکتے ہیں جس میں سے فقط ایک کو cherry-pick کر کے اپنا استدلال کرنا متن کو محدود کرنا بھی ہے اور اس کے ساتھ ناانصافی بھی ہے۔

قرآن میں تضادات نکالنے کا رواج نیا نہیں ہے بلکہ یہ اوائل اسلام سے چلا آ رہا ہے، مروی

ہے کہ فیلسوف اسحاق کندی نے بھی قرآن کے تضادات پر کتاب لکھی تھی جس کے رد پر امام عسکری علیہ السّلام نے اس سے سوال کیا کہ آیا وہ جو مفہوم سمجھا ہے وہی خدا کا مقصود تھا تو اس نے اپنی کتاب ترک کردی ،چونکہ وہ سمجھ گیا کہ وہ غلطی کر رہا ہے۔لہذا سائنس اور دین کا paradigm بالکل الگ ہے،ان کے سوالات بالکل الگ ہیں،ان کی ،حقیقت کو سمجھانے اور سمجھنے کی زبان بالکل الگ ہے۔

دونوں میں شاید لفظی اور ظاہری تضاد ہوسکتا ہے،لیکن حقیقی تضاد نہیں۔

مذہب چونکہ ماورائی اور غیر مادی حقائق پر بھی کلام کرتا ہے تو اس کو زبان میں سمجھانے کے لیے تمثیلات بیان کرنا ضروری ہوجاتی ہیں،اوران تمثیلات کو ایک طرف ظاہر پرست مذہبی نہیں سمجھتے جس سے وہ عجیب وغریب نتائج نکالتے ہیں جیسے خدا کے ہاتھ یا اس کا چہرہ ہونا،اور دوسری طرف ظاہر پرست مخالفین مذہب ایسی عبارات کا استعمال کرتے ہوئے مذہب کی نفی کرنا چاہتے ہیں،ہم ان دونوں منہج سے بُری ہیں۔

دین کی زبان ایک خاص انداز میں رکھی گئی ہے تا کہ زیادہ سے زیادہ لوگ اس میں سے کچھ نہ کچھ حاصل کرلیں۔اگر اس میں پیچیدہ فلسفی ابحاث اور سائنسی باتیں ہوتیں تو شاید دنیا کی پانچ سے دس فیصد آبادی اس سے متاثر ہوتی اور پڑھتی۔

آج عام کسان بھی قرآن پڑھ کر اس میں سے کچھ نہ کچھ لے لیتا ہے اور عقلی فلسفی بھی اس میں سے مطالب اخذ کرتا ہے۔اللہ نے قرآن کو اس طرح سے بیان کیا کہ سب سے کم سطح کی عقول کے مطابق اس کو علامتی رکھا جائے تا کہ وہ بھی اس سے اخذ کریں اور ساتھ ہی ان علامات وتمثیلات سے فلسفی اور اعلیٰ سطح کی عقول والے بھی مطالب نکال لیں۔ یہ اس لیے کہ کتاب نازل کرنے والا انسانی نفسیات سے بخوبی واقف ہے۔جب اس انداز میں بات کی جائے گی اور جنت وجہنم کو تمثیلی انداز میں بیان کیا جائے گا تو اس سے زیادہ سے زیادہ لوگ مرغوب ومرعوب ہونگے اور کسی نہ کسی بہانے اور معرفت کے کسی نہ کسی درجے پر ہوتے ہوئے دین سے متمسک رہیں گے۔یہی

حکمت ہے کہ خداوندعزوجل نے دینی متون میں اس انداز میں کلام کیا ہے۔

سائنس کے ذریعے مذہب کا اثبات کرنا درست روش نہیں ہے۔ جوافراد ایسا کرتے بھی ہیں وہ نظریہ ارتقاء کی باری آتے ہی کہتے ہیں کہ یہ تو فقط ایک نظریہ ہے، سائیں تو بدلتی رہتی ہے، اور جب کچھ آیات یا روایات بظاہر سائنس سے ٹکراتی ہیں تب بھی وہ سائنس کے تغیر کا حوالہ دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ سائنس کوئی اٹل حجت نہیں۔لیکن پھر یہی افراد اپنی مرضی کی سائنس لیتے ہوئے مذہبی امور کو کیوں ثابت کرتے ہیں؟ کیا یہ دوہرا معیار نہ ہوگا؟

دونوں کا مقصد الگ ہے، اور دونوں کو آپس میں ملانا دونوں پر ہی ظلم کرنا ہے۔

چوتھی دلیل : منطقی استدلالات

کیا خدا اتنا بھاری پتھر بنا سکتا ہے جو خود نہ اٹھا سکے ؟ یہ اور اس سے متعلقہ سوالات omnipotence paradox کا حصہ ہیں۔ یہ سوالات اس لیے ہوتے ہیں کیونکہ ابراہیمی تصور خدا میں خُدا mipotent یعنی علی کل شیء قدیر ''(ہر چیز پر قادر) ہے۔''

اگر ہم کہیں وہ ایسا پتھر بنا سکتا ہے تو اس کا معنی ہوگا وہ اس کو اٹھا نہیں سکتا اور ہر چیز پر قادر نہیں اور اگر ہم کہیں وہ ایسا پتھر نہیں بنا سکتا تو وہ ہر چیز پر قادر نہیں۔

جواب: ''کیا خُدا کوئی ایسا کام کرسکتا ہے جو وہ نہیں کرسکتا'' پس یہ سوال خود ایک اندرونی مغالطہ اور تضاد کا شکار ہے اور صرف الفاظ اور زبان کا کھیل ہے۔ جیسے اگر میں کہوں کیا خُدا ایسی مخلوق بنا سکتا ہے جس کا کوئی خالق نہ ہو؟ تو اگر وہ بنا سکتا ہے، تو وہ ہر چیز کا خالق نہیں، اور اگر وہ نہیں بنا سکتا تو وہ ہر چیز پر قادر نہیں۔لیکن یہ سوال خود تضاد کا شکار ہے کیونکہ جب کوئی چیز مخلوق ہے تو اس کا خالق ہونا لازم ہے۔اس سے ملتا جلتا سوال ہے کہ کیا اللہ اپنا جیسا کوئی خُدا بنا سکتا ہے؟ اگر کہیں ہاں، تو یعنی دو خُدا ہو سکتے ہیں، اگر کہیں نہ تو یعنی خُدا ہر چیز پر قادر نہیں۔ ہم کہتے ہیں کہ جب خُدا نے کچھ بنا دیا ہو تو وہ کبھی خُدا نہیں ہوسکتا کیونکہ وہ اس کا محتاج ہوگا، اس کی طرح واجب الوجود

بذاتہ یا لذاتہ نہیں ہوگا نہ ہی مسبب الاسباب اور مکون الاکوان ہوگا تو اس پر اسم خدا کا اطلاق ہی نہیں ہوسکتا۔ اس لیے یہ نہیں کہا جاتا کہ خُدا اس پر قادر نہیں، بلکہ یہ کہا جاتا ہے کہ وہ چیز ہی ایسی ہے کہ وہ وجود میں نہیں آسکتی، اس میں نقص خُدا نہیں بلکہ اس چیز کی ظرفیت کی طرف پلٹتا ہے۔ اور کیونکہ جو پیدا ہو جائے گا وہ ممکن الوجود ہوگا جبکہ خُدا کہتے ہی اس کو ہیں جو واجب الوجود ہے، اور بیک وقت ایک چیز ممکن اور واجب نہیں ہوسکتی کیونکہ یہ منطقی اساس پر قائم ہے۔ خدا کی قدرت کے متعلق ہم یہ کہتے ہیں کہ وہ تمام منطقی ممکنات و جائزات پر قادر ہے اور ہر مقدور پر قادر ہے جس پر لفظ ''شی ء'' کا اطلاق ہوسکتا ہے، چونکہ ایک محال چیز پر لفظ ''شی'' کا اطلاق نہیں ہوسکتا تو وہ اس زمرے سے خارج ہے۔ جیسے ہم یہ نہیں کہتے کہ خدا اس پر قادر ہے کہ مخلوق بن جائے، اور یہ ایک منفی چیز ہے جس سے خُدا ویسے ہی پاک ہے۔ ہم خدا کو تمام عیوب و نقائص سے منزہ و مبرا جانتے ہیں اور اس سبب اس کو ان سے نسبت نہیں دیتے۔ ایسے ہی اگر کوئی کہے کہ آیا خدا گناہ کرسکتا ہے؟ اگر ہاں، تو وہ خیر محض نہیں۔ اگر نہ تو وہ ہر چیز پر قادر نہیں۔ تو ہم کہتے ہیں کہ گناہ کرنا خدا کی ذات کے خلاف ہے کیونکہ وہ عیوب سے پاک ہے، اور اس کا ایسی چیز کرنا جو اس کی ذات کے خلاف ہے محال ہوگا۔ فلاسفہ اور متکلمین کا اتفاق ہے کہ خدا ہر چیز پر قادر ہے جو ممکنات میں سے ہو یعنی محالات کا اس سے صادر ہونا محال ہے۔

کیونکہ اگر خدا محال کرسکتا ہے تو اس کا مطلب ہے محال چیز، ہوسکتی ہے، اور اگر محال چیز ہو سکتی ہے تو وہ پھر محال رہی ہی نہیں، پس یہ کہنا کہ کوئی محال پر قادر ہے، اجتماع نقیضین ہے کیونکہ اس نے محال اور ممکن کو ایک جگہ جمع کر دیا ہے، قدرت صرف ممکنات پر ہی ہوتی ہے۔

ایک اور اشکال جو ابراہیمی خدا پر کیا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ اگر خدا کو سب پتا ہے تو اس کو ماضی، حال اور مستقبل کا علم ہے۔ پھر ہمارے پاس آزاد ارادہ (Free Will) کیسے ہے؟

اس کا خلاصہ یہ ہے کہ کسی چیز کا علم ہونا اور کسی سے کچھ کروانا دو الگ چیزیں ہیں۔

پانچویں دلیل: خدا کو کس نے بنایا(Who Created God)

یہ سوال بھی بہت سے انسان کرتے ہیں کہ اگر اللہ نے سب کچھ بنایا ہے تو اللہ کو کس نے بنایا ہے؟ یہ سوال بھی پچھلے اشکالات کی طرح عبث ہے اور فقط الفاظ کا کھیل ہے۔ کیونکہ ہم خُدا کو واجب الوجود مانتے ہیں۔

اگر ہم کہیں کہ واجب الوجود کو کس نے بنایا؟ تو اس کا معنی یہ ہوگا کہ وہ واجب الوجود ہی نہیں ہے کیونکہ اس کے پیچھے کوئی علت ہے جس نے اس کو بنایا ہے۔ لیکن جیسے ہی ہم ایک واجب وجود پر آ کر منتہی ہوتے ہیں ہمیں ماننا پڑتا ہے کہ وہ کسی کا محتاج نہیں اور اس کی کوئی علت نہیں تو خود ہی اس کو کسی کے خلق کرنے کا رد ہو جاتا ہے۔ اگر اس کو کسی نے خلق کیا ہے تو یہ وہ واجب ذات نہیں ہے جس کو ہم مانتے ہیں بلکہ یہ ممکن الوجود میں سے ہے۔ کچھ اس کو یوں بھی پیش کرتے ہیں کہ اگر یہ کائنات اتنی پیچیدہ ہے تو اس کو ایک خالق کی ضرورت ہے، تو پھر وہ خالق تو اس سے بھی زیادہ پیچیدہ ہوگا، پھر اس کو کس نے بنایا؟ لیکن ہم کہتے ہیں کہ ایسے ملحد نے مغالطہ انجام دیا ہے کیونکہ ہم نے کبھی دعویٰ نہیں کیا کہ خدا پیچیدہ ہے۔

یہ اعتراض ان پر ہوگا جو خُدا کو ذات اور صفات کا مرکب یعنی پیچیدہ مانتے ہیں کیونکہ اگر وہ کائنات کی پیچیدگی کو صانع کی دلیل بناتے ہیں تو پھر خُدا کی پیچیدگی پر کوئی صانع یعنی بنانے والا کیوں نہیں؟ اگر خُدا کا کوئی بنانے والا نہیں۔ باوجود پیچیدگی کے تو پھر خدا کی ضرورت ہی کیوں ہے۔ کائنات کے بارے میں ہی کہہ دینا چاہیے کہ پیچیدگی کے باوجود اس کا کوئی بنانے والا نہیں۔

جواب: خدا سب سے سادہ حقیقت اور سب سے بسیط وجود ہے کیونکہ اس میں تعدد نہیں ہے، جیسے جیسے موجودات کا سلسلہ آگے بڑھتا ہے خُدا سے ویسے ویسے پیچیدگی ظاہر ہوتی رہتی ہے اور اس سبب عالم مادہ میں پیچیدگی ہے۔ اگر ملحد کہے کہ سادہ چیز سے پیچیدہ چیز کیسے آسکتی ہے، تو اس کا رد خود اس کے نظریہ میں ہی ہے کیونکہ ارتقاء کے تحت ایک زندہ خلیہ(single celled organism) سے ہم جیسی پیچیدہ مخلوقات جیسے انسان اور پرندے اور گائے وغیرہ وجود میں

آئے ہیں،تو اگر وہ مانتا ہے کہ سادہ سے پیچیدہ نہیں آسکتا تو اس کو ارتقاء کا بھی انکار کرنا پڑے گا۔

چھٹی دلیل: شگاف کا خدا(God of the Gaps)

ایک اور اشکال جو ملحدین وجود خدا پر کرتے ہیں یہ ہے کہ درحقیقت مذہبیوں نے ایسا خدا بیان کیا ہے کہ جب ہمیں کسی چیز کی حقیقی علت معلوم نہ ہوتو ہم اس کو خُدا سے نسبت دے دیتے ہیں۔

چنانچہ مذہبی افراد کا خدا اس ایک شگاف کا خُدا ہے کہ جہاں علمی شگاف یا کمی نظر آئی کسی چیز کی شرح کرنے میں وہاں خُدا کو بطور شرح کھ دیا اس شگاف کو پُر کرنے کے لیے۔

جواب: اولا آپ کے استدلال سے وجود خدا کا بطلان لازم نہیں آتا نہ ہی عدم وجود پر یہ کوئی دلیل ہے اور اس سے خُدا کے وجود کی نفی نہیں ہوتی۔

یہ اشکال وجود خداوندی کی بنسبت مذہبیوں کے اعمال سے زیادہ مربوط ہے ۔

ثانیا: بقول شما ہم نے ہر اس چیز کو خُدا سے نسبت دے دی جس کا ہمیں علم نہیں کہ اس کا سبب کیا تھا۔تو ایسا نہیں ہے کیونکہ ہم جب اس بات کو ثابت کر دیتے ہیں کہ ایک علت اولی یا مسبب الاسباب ہے جس نے تمام خلائق کو خلق کیا ہے تو پھر تمام تکوینی امور کی بازگشت اسی کی جانب ہوتی ہے۔

وَإِلَى اللَّهِ تُرْجَعُ الْأُمُورُ

(البقرہ:۲۱۰)،(آل عمران:۱۰۹)،(الأنفال:۴۴)،(الحج:۷۶)،(فاطر:۴)،(الحدید:۵)

اور امور کی بازگشت اللہ ہی کی طرف ہوتی ہے۔لہٰذا ہمارا یہ کہنا کہ بارش اللہ نے برسائی ہے اس بات کے منافی نہیں کہ بارش بادلوں سے آتی ہے اور وہ پانی بخارات کی صورت میں بادلوں میں منتقل ہوتا ہے کیونکہ دونوں باتیں صحیح ہیں اور ایک چیز کا اثبات دوسرے کی نفی نہیں کرتا۔یا ہمارا کہنا کہ فلاں قدرتی آفت عذاب الٰہی ہے اس کے منافی نہیں کہ اس کے کچھ قدرتی محرکات بھی ہیں

کیونکہ وہ چیز رونما ہونا خدا کے ارادہ اور مشیت کے تحت تھا تو اس اعتبار سے پھر بھی اس کی نسبت بالآخر خدا سے ہی جا ملتی ہے۔

کیونکہ اس میں یہ سمجھنے سے کوتاہی کی گئی ہے کہ ایک چیز کی نسبت خدا اور قدرتی اسباب سے بھی ہوسکتی ہے اس طرح کہ وہ چیز اگر چہ کسی قدرتی سبب کے تحت ہی ظاہر ہو رہی ہے مگر بالآخر ارادۂ الٰہی کے تابع ہے تو اس وجہ سے اسکی بازگشت خدا ہی کی طرف ہے۔

باب دوم: سائنس اور اِلحاد

ملحدین جدید سائنس کے استعمال سے مذہب اور خدا کے رد کی کوشش کرتے ہیں بلکہ اس کو خدا اور مذہب کا متبادل سمجھ کر پیش کرتے ہیں کہ ہمیں اب چونکہ ارتقاء سے معلوم ہو گیا کہ انسان کیسے آئے اور انفجار عظیم (big bang) سے معلوم ہو گیا کہ کائنات کیسے بنی تو ہمیں لئے مذہب و خُدا کی احتیاج ہی نہیں، ان چیزوں کی تعلیل (Explanation) کے لئے۔

فصل: فلسفۂ سائنس (The Philosophy of Science)

دور حاضر میں سائنس کی نئی ایجادات اور دریافتوں نے سائنس کو لوگوں کی نگاہ میں جو مقام دیا ہے وہ کسی پر مخفی نہیں۔

سائنسی طریقہ کار کی افادیت سے کسی کو انکار نہیں۔لیکن سوال یہ ہے کہ کیا سائنس ہر چیز میں حق و باطل کا معیار قرار پاسکتی ہے؟ کیا سائنس کے علاوہ حق جاننے کا کوئی راستہ نہیں؟ اور ایسے دیگر بہت سے سوالات جن پر صدیوں سے فلسفہ سائنس میں بحث کی جاتی رہی ہے۔

بنیادی طور پر تو سائنس، در اصل فلسفے کی ہی ایک شاخ تھی جس کا تعلق Natural Philosophy سے تھا، اس لیے قدیم ادوار میں جو فلاسفہ تھے وہ حیاتیاتی علوم، کیمیاء، طبیعیات یعنی مشاہداتی و تجربی علوم میں اتنی ہی دلچسپی لیتے تھے جتنی وہ عقلاتی علوم میں رکھتے تھے رفتہ رفتہ

سائنس کی ایک جُداگانہ شناخت پیدا ہوگئی اوراس نے ایک الگ علم کی حیثیت اختیار کرلی ہے۔ بعض متدینین کے نزدیک سائنس نے فلسفے کی ضرورت ختم کردی ہے کیونکہ اب سائنس ہمیں ہر چیز کا جواب دے دیتی ہے۔لیکن اس کے باوجود اگر کسی انسان نے تھوڑا سا بھی سائنس کا فلسفہ پڑھا ہو وہ اس قضیہ سے آشنا ہوگا کہ سائنس جن بنیادی بدیہیات اور مفروضات پر قائم ہے وہ سب فلسفی اساس رکھتے ہیں اور سائنس اس اعتبار سے کبھی فلسفے سے جدا نہیں ہوسکتی۔ ہاں، مادی مشاہدات اور تجربات پرکھنے کے لیے سائنس سے بہتر کوئی ذریعہ ہمارے پاس نہیں لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ سائنس ہمیں اخلاقیات بھی سکھاسکتی ہے یا ہمیں یہ سکھاسکتی ہے کہ سب سے اچھا سیاسی فلسفہ یا حکومت چلانے کا طریقہ کیا ہے یا معاشرتی علوم یا تاریخ میں سائنس سے کام لیا جائے گا کیونکہ وہاں بحث وتحقیق کا انداز الگ ہے اگرچہ وہاں بھی سائنس کی مدد ضرور لی جاسکتی ہے بعض جزوی امور میں۔

سائنس کی بنیاد سائنسی طریقہ کار (scientific method) پر ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ کسی چیز پر سوال اٹھا کر تحقیق کی جاتی ہے اور پھر اس پر ایک مفروضہ (hypothesis) قائم کیا جاتا ہے کہ اگر ایسا ہو تو اس کا نتیجہ یہ نکلے گا، پھر تجربات کرکے ان کا مشاہدہ کیا جاتا ہے اور نتائج لیے جاتے ہیں۔اس کے بعد دوبارہ سے ان تجربات اور اختیارات کو دوہرایا جاتا ہے کیونکہ سائنس میں یہ ضروری ہے کہ کوئی اختبار replicable ہو۔ جب یہ مفروضہ بہت سے سخت تجربات اور اختیارات سے گذر جائے اور اس کے ابطال کا امکان بہت کم رہ جائے سخت امتحانات سے گزار کر تب یہ مفروضہ ایک نظریہ (theory) کا درجہ پالیتا ہے جو کہ سائنس میں سب سے بلند مقام ہے جو کوئی آئیڈیا پاسکتا ہے۔ایک نظریہ ضروری نہیں سو فیصد درست ہو، مگر موجود تجربات کی روشنی میں وہ سب سے اچھی شرح سمجھ جاتی ہے ان نتائج اور دلائل کی۔

سائنس کے فلسفے کی اساس realism پر ہے، کہ خارجی دنیا وجود رکھتی ہے۔ realism بمقابلہ Anti-realism ہے۔

سائنس کے فلاسفہ اس پر بٹے ہوئے ہیں کہ جو چیزیں مشاہدہ نہیں کی جاسکتیں یعنی unobservable ہیں ان کے متعلق انسان متشکک رہے یا نہیں۔ جیسے درخت اور پتے مشاہداتی چیزیں ہیں، لیکن پروٹین اور الیکٹرون غیر مشاہداتی ہیں۔ بعض ان کے درمیان تفریق کرتے ہیں اور جو غیر مشاہداتی چیز ہے اس کے بارے میں anti-realist نظریہ رکھتے ہیں، لیکن اس کے مخالف scientific realism کے قائلین سائنس کے مشاہداتی اور غیر مشاہداتی اور ہر دو قضیوں کے قائل ہیں۔

سائنس کے کچھ دیگر مفروضات میں سے علت و معلول یعنی علیت کا وجود ہے، اور ساتھ ہی ساتھ یہ کہ قدرتی مظاہر کے قدرتی اسباب ہوتے ہیں اور ایک مفروضہ یہ بھی ہے کہ بیرونی دنیا اس قابل ہے کہ ہم اس کا مشاہدہ کر کے اس سے علم اخذ کر سکتے ہیں۔ یہ سب بنیادی مفروضات ہیں اور ان کا انکار کرتے ہوئے سائنس نہیں کی جاسکتی پس ان کو سائنس کے پیش فرض کہا جاسکتا ہے۔ سائیں بنیادی طور پر A Posteriori کام کرتی ہے۔ بیرونی دنیا کے مشاہدات اور تجربات کے ذریعہ جو علم حاصل کیا جاتا ہے اس کو posteriori2 علم کہا جاتا ہے جبکہ عقلانی طور پر جو علم حاصل کیا جاتا ہے اس کو a priori کہا جاتا ہے۔ سائنسی چلتی ہے PSR یعنی principle of sufficient reason پر، کہ جو بھی ہم مشاہدہ کرتے ہیں اس کی کوئی نہ کوئی وجہ ہے جو دریافت کی جاسکتی ہے۔ لیکن اگر PSR مان لیا جائے تو اس کا لازمہ یہ ہے کہ ایک واجب الوجود ماننا پڑے گا۔ اور اگر PSR کا انکار کیا جائے واجب الوجود کی نفی کے لیے تو پوری سائنس کا ہی انکار کر دینا پڑے گا کیونکہ سائنس کی علمیاتی بنیاد ہی اس پر ہے کہ ترجیح بلا مرجح محال ہے اور ہر مشاہداتی و تجرباتی چیز کی کوئی نہ کوئی علت ضرور ہوتی ہے۔

کیا سائنس ہی حق تک پہنچنے کا واحد ذریعہ؟ اگر کوئی کہے ہاں، تو پھر وہ اس نتیجے تک کیسے پہنچا، کیا اس نے اس دعوے کے اثبات کے لیے بھی سائنس کا استعمال کیا ہے؟ اگر ہاں، تو یہ دور (circular reasoning) کا مغالطہ ہے۔ اور اگر نہ، تو اس کا مطلب ہے کہ اس نے

سائنس کے علاوہ کسی ذریعہ کا استعمال کیا ہے اور دیگر ذرائع بھی حق کو جاننے کے لیے وجود رکھتے ہیں۔ سائنس ہمیں اخلاقیات نہیں دیتی، اس کے لیے ہمیں moral reasoning کرنی پڑتی ہے، اسی طرح سائنس ہمیں ریاضیات بھی نہیں سکھاتی بلکہ ریاضیات کی اساس منطق پر کھڑی ہے اور خود سائنس بھی منطق کی اساس پر کھڑی ہے۔ نیز ہم گواہیوں کی بناء پر بھی علم تک پہنچ سکتے ہیں، خصوصاً جب ان گواہیوں کی تعداد بہت زیادہ ہو۔ جیسے میں کبھی مصر نہیں گیا لیکن جو لوگ وہاں گئے ہیں ان سے ملا ہوں اور انہوں نے ادھر موجود اہرام (pyramids) کے وجود کا اقرار کیا ہے اور اس پر میں نے متعدد تصاویر بھی دیکھی ہیں، ان سب گواہوں کی بنا پر میں اسکے متعلق اطمینان پا سکتا ہوں کہ مصر میں اہرام موجود ہیں۔

اگر کوئی کہے کہ سائنس برحق ہے کیونکہ وہ کام کرتی ہے اور عملاً چیزوں کو چلا کر دکھاتی ہے، تو یہ ایک مغالطہ ہے کیونکہ کسی چیز کا فائدہ دینا اس کے برحق ہونے کی دلیل نہیں ہوتی۔ اس کو pragmatism کا نظریہ کہتے ہیں کہ کوئی چیز چونکہ عملی طور پر کام کرتی ہے تو یہی اس کے برحق ہونے کی دلیل ہے۔ لیکن ہم کہتے ہیں کہ کسی چیز کی افادیت اس کی حقانیت کی دلیل نہیں ہے۔

باب سوم: ارتقاء اور الحاد

چونکہ ملحدین ارتقاء کو مذہب سے متضاد بنا کر پیش کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اب جبکہ ارتقاء حق ثابت ہو گیا اور ارتقاء کے نتائج مذہب سے متضاد ہیں تو ارتقاء کا اثبات یعنی مذہبی دعوؤں کی نفی ہے جس سے مذہبی بیانیہ دربارہ خلقت انسان غلط ثابت ہو جاتا ہے اور مذہبی الہامی کتب زیر سوال آجاتی ہیں۔

جواب: نظریہ ارتقا (evolution) اسلام سے متضاد ہے؟

سائنس میں تھیوری ایک ایسا نظریہ کہلاتا ہے جو سب سے اعلیٰ درجے پر فائز ہو جائے متعدد و شدید تجربات و اختیارات کے بعد، جیسے کشش ثقل (gravity) بھی سائنس میں ایک تھیوری ہی

ہے، مگر ہم اس کے وجود کا انکار تو نہیں کرتے اس کے سبب۔ یہ ارتقا کی تھیوری ایک پیچیدہ نظریہ ہے جو عام شخص کی سطح سے اوپر کا ہے، اگر کوئی ارتقاء کا رد کردے تو حیاتی سائنس میں یہ بہت بڑی تبدیلی ہوگی اور کوئی شبہ نہیں کہ اس شخص کو اگلا نوبل پرائز مل جائے، ارتقاء کو غلط ثابت کرنا اتنا آسان ہے کہ ایک فوسل (fossil) دکھادیا جائے جو غلط طبقے میں موجود ہو اس کو غلط ثابت کرسکتا ہے، مگر اب تک ایسا نہیں ہوا۔

ارتقاء کے مطابق ہر جاندار چیز کا صدور (origin) ایک ہی ہے، اور ارتقاء کے مطابق ہر جاندار چیز کا آپسی تعلق ہے، اس بات کی سب سے بڑی دلیل ڈی این اے (DNA) ہے اور ایسے ہی جینومز (Genomes)، جو کہ درخت، انسان، گائے، وغیرہ ہر چیز میں پائے جاتے ہیں، ایسے ہی ہیومن جینوم پروجکٹ (Human Genome Project) ہے جس میں انسان کے تمام جینیاتی سٹریکچر کو میپ کرلیا گیا ہے۔ یہی بات قرآن کرتا ہے کہ تمام زندہ چیزوں کی شروعات ایک ہی جگہ سے ہوئی، اس کے بعد تنوع آیا:... وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَاءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ. (الانبیا: ۳۰) اب یہ سوال ہے کہ اسلامی نقطہ نگاہ سے تنوع کیسے پیدا ہوا، تو اس میں کوئی خاص وضاحت نہیں ملتی، اور ہم نے پانی سے ہر زندہ چیز بنائی۔ ہاں ارشاد باری تعالی ہے کہ خود مشاہدہ کرو اس چیز کا؟

قُلْ سِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَانْظُرُوا كَيْفَ بَدَأَ الْخَلْقَ (العنکبوت: ۲۰)

کہہ دیجئے: زمین میں سیر کرو اور دیکھو کیسے اللہ نے پیدائش کی ابتداء کی۔

تو یہ ایک دعوت ہے مشاہدہ کرنے کی، ابتداء تخلیق کے متعلق۔ ایک لطیف نکتہ یہ بھی ہے کہ خدا کا ایک نام ''الباری'' ہے جس کا مطلب کسی چیز کو ترقی یا ارتقاء دینے والے کا ہے۔

اب جہاں تک ارتقاء کی بات ہے تو ہمیں سب سے پہلے یہ دیکھنا ہے کہ آدم علیہ السلام سب سے پہلے بشر نہیں تھے۔ اس پر کوئی صحیح، صریح حدیث نہیں ہے کہ وہ پہلے بشر تھے۔ بلکہ ایسی روایات ہیں کہ آدم علیہ السلام سے قبل بھی اوادم (آدم کا جمع) موجود تھے اور یہ کہ زمین پر پہلے بھی

لوگ آباد تھے اگر چہ وہ انسانی نوع سے تعلق نہ رکھتے ہوں۔ایک روایت کے مطابق آدم علیہ السلام صرف اس بشر (أَبَا هَذَا الْبَشَرِ) کے والد ہیں ’’نہ کہ تمام بشروں کے‘‘ (۱)

کم ازکم اب کسی کودیگر سپیشیز کے بشروں کا انکارنہیں کرنا چاہیے جب ہم نے باقاعدہ ان کی ہڈیاں کھوج کران کی کاربن ڈیٹنگ کر کے دریافت بھی کرلیاہے کہ یہ پچاس ہزار یا پچاس لاکھ سے بھی زیادہ سال پرانے انسان نما لوگ تھے۔اس کی طرف قرآن کی آیت انی جاعل فِيْ الْأَرْضِ خَلِيفَةً میں اشارہ ہے۔

جیسے امام علیہ السلام سے تفسیر منقول ہے:

قَالَ: قَالَ هِشَامُ بْنُ سَالِمٍ، قَالَ أَبُو عَبْدِاللَّهِ (عَلَيْهِ السَّلَامُ): مَا عَلِمَ الْمَلَائِكَةُ بِقَوْلِهِمْ : أَتَجْعَلُ فِيهَا مَنْ يُفْسِدُ فِيهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَاءَ لَوْلاأَنَّهُمْ قَدْ كَانُوا رَأَوْا مَنْ يُفْسِدُ فِيهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَاءَ..

ہشام بن سالم نے کہا: امام جعفر صادق علیہ السّلام نے فرمایا: فرشتے اپنی بات کو نہ جانتے (کیا تو زمین میں ان لوگوں کو خلیفہ بنائے گا جو فساد کریں گے اور خون بہائیں گے) اگر انہوں نے پہلے ہی ان لوگوں کو نہ دیکھا ہوتا جو زمین میں خون بہار ہے تھے۔(تفسیر العیاشی، جلد ا،ص۲۱) اس کے علاوہ مختلف روایات ہیں جن میں نسناس کا ہماری زمین پر آدم علیہ السّلام سے قبل آباد ہونے کا ذکر ہے، جیسے روایت میں ہے:

إِنَّ اللَّهَ تَبَارَكَ وَتَعَالَى أَرَادَ أَنْ يَخْلُقَ خَلْقاً بِيَدِهِ، وَذَلِكَ بَعْدَ مَا مَضَى مِنَ الْجِنِّ وَالنَّسْنَاسِ فِي الْأَرْضِ سَبْعَةَ الْآفِ سَنَةٍ..(علل الشرائع، ج1،ص104،105)

امام علی علیہ السلام نے فرمایا: اللہ تبارک وتعالی نے ارادہ کیا کہ اپنے ہاتھ سے ایک مخلوق خلق کرے، اور یہ اس کے بعد تھا کہ جن ونسناس زمین پر سات ہزار سال سے آباد تھے۔

لَقَدْ خَلَقَ اللهُ عَزَّوَجَلَّ فِي الْأَرْضِ مُنْذُ خَلَقَهَا سَبْعَةَ عَالَمِينَ لَيْسَ هُمْ وُلْدَ آدَمَ خَلَقَهُمْ مِنْ أَدِيمِ الْأَرْضِ فَأَسْكَنَهُمْ فِيهَا وَاحِداً بَعْدَ وَاحِدٍ مَعَ عَالَمِهِ ثُمَّ خَلَقَ اللهُ عَزَّوَجَلَّ آدَمَ أَبَا هَذَا الْبَشَرِ وَ خَلَقَ ذُرِّيَّتَهُ مِنْهُ (خصال ، شیخ صدوق، ج2،ص359،ط جامعہ مدرسین۔ تفسیر العیاشی ج1، ص29

اب آدم علیہ السلام اور باقی سب چیزوں کی خلقت کے متعلق مختلف نظریات ہیں۔ جیسے بعض نے مسیحیوں کی creationist طرز کی تھیوری کو اپناتے ہوئے رائے اپنائی کہ ایک دن کچھ نہیں تھا، اگلے دن اللہ نے سب کچھ خلق کر دیا اور زمین پر تمام جاندار آ گئے۔ اس کے علاوہ بعض نے کہا کہ ارتقاء تو ہوا اور تمام جاندار مثلاً درخت اور جانوروں کا تنوع اس طرح سے سامنے آیا، یعنی جانوروں میں بھی ارتقاء ہوا، مگر آدم علیہ السلام اس سے مستثنیٰ ہیں۔ جمال الدین افغانی نے بھی یہ رائے اپنائی اور وہ ارتقاء کے قائل تھے کہ جانور تو اس طرح سے ارتقاء کر کے آئے ہیں البتہ آدم علیہ السّلام اور انسان کے لیے وہ اس کے قائل نہیں تھے۔ ایسے ہی محمد عبدہ اور دیگر الازھر کے علماء نے بھی کہا کہ ارتقاء، تو بالکل ہوا ہے خلائق میں مگر آدم علیہ السلام معجزہ ہیں۔ ایسے ہی بعض نے کہا ہے کہ آدم علیہ السلام ایک نہیں تھے بلکہ بہت سے آدم تھے، یہ بات ہماری بعض احادیث میں بھی موجود ہے۔ جیسے مثلاً:

.. وَاللّٰهِ لَقَدْ خَلَقَ أَلْفَ أَلْفِ عَالَمٍ ، وَأَلْفَ أَلْفِ آدَمٍ ، أَنْتَ فِي آخِرِ تِلْكَ الْعَوَالِيمِوَ أُولَئِكَ الآدمين...

''امام باقر علیہ السّلام نے فرمایا: بخدا، اللہ نے دس لاکھ جہاں بنائے اور دس لاکھ آدم بنائے اور تم ان جہانوں اور ان آدموں میں سے آخری ہو۔'' (التوحید، ص 277، الخصال، ص 652)

جیسے ہم نے جن اور بن (نسناس) کا ذکر کیا ہے۔ ایک اور پہلو اس آیت سے متصل ہے:

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنسَانَ مِن سُلَالَةٍ مِّن طِينٍ۔ ثُمَّ جَعَلْنَاهُ نُطْفَةً فِي قَرَارٍ مَّكِينٍ ۔ (المؤمنون ۱۲، ۱۳)

''یقیناً ہم نے انسان کو مٹی کے جوہر سے پیدا کیا۔ پھر اسے نطفہ بنا کر محفوظ جگہ میں قرار دے دیا۔'' (المؤمنون: ۱۲، ۱۳)

ادھر انسان کو مٹی کے جوہر سے خلق کرنے کی بات کی جا رہی ہے، جس میں آدم علیہ اسلام بھی شامل ہیں۔ جیسے کہ بعض مفسرین نے اس طرف اشارہ کیا ہے۔ علامہ طباطبائی لکھتے ہیں۔

وظاهر السياق أن المراد بالإنسان هو النوع فيشمل آدم ومن دونه ويكون المراد بالخلق الخلق الابتدائي الذي خلق به آدم من الطين

اور سیاق سے ظاہر ہے کہ انسان سے مراد (انسانی) نوع ہے، تو آدم علیہ السلام اس میں شامل ہیں، اور جو ان کے علاوہ ہے۔ اور خلق کرنے سے زیادہ ابتدائی خلق ہے جس سے آدم علیہ السلام مٹی سے ہے۔ (تفسیر المیزان، 15، ص19)

شیخ طوسی علیہ الرحمہ نے اسی آیت کی بابت قتادہ کا قول نقل کیا ہے:

وَقَالَ قَتَادَةُ: المراد بالإِنْسَانِ آدم، لأنه استل من أديم الأرض

اور قتادہ نے کہا: انسان سے مراد اس آیت میں) آدم علیہ السلام ہیں، کیونکہ وہ زمین کی سطح (ادیم) سے لیے گئے۔ (التبیان فی تفسیر القرآن، ج7، ص353)

نوٹ: آئمہ علیہم السلام سے بھی ایک معتبر حدیث میں مروی ہے کہ آدم علیہ السلام زمین کی سطح (ادیم) سے بنے ہیں۔

(علل الشرائع، ج1، ص14۔ قال إنما سمي آدم أتم لأنَّهُ خُلِق من أَديما الأرض...)

اس آیت میں قرار مکین سے مراد رحم مادر ہے، اس طرف بھی بہت سے لوگوں نے اشارہ کیا ہے جیسے شیخ طبرسی رضی اللہ عنہ نے کہا نیز تفسیر مجمع البیان میں بھی ہے:

(فی قرار مکین) یعنی الرحم

نیز علامہ فیض کاشانی قدس اللہ نفسہ۔ (تفسیر مجمع البیان، ج10، ص232)

اور تفسیر قمی میں بھی علی بن ابراہیم قمی رحمہ اللہ سے یہی منسوب ہے (تقسیم الاصفی، ج2، ص1392)

سوال یہ ہے کہ اگر انسان سے مراد آدم علیہ السلام ہیں تو وہ کس رحم میں بطور نطفہ رکھے گئے۔ کچھ نے کہا کہ ایک مصنوعی رحم (artificial womb) بنایا گیا جس میں پھر آدم علیہ السلام بطور نطفہ رکھے گئے، جبکہ بعض نے کہا کہ آرٹفیشل کی کیا ضرورت ہے جب حقیقی ارحام موجود تھے

تو آدم علیہ السلام کو اس قرار مکین میں رکھا جا سکتا تھا، جیسے عبد الصبور شاھین نے کہا ہے۔

اسی طرح دوسری آیت ہے

وَقَدْ خَلَقَكُمْ أَطْوَارًا ۔

''اور اس نے تمہیں مختلف مراحل میں خلق کیا ہے۔'' (نوح: ۱۴)

جبکہ عربی میں ارتقاء کے لیے لفظ بھی تطور استعمال ہوتا ہے اور ادھر بھی طور و اطوار کی بات ہو رہی ہے۔ کہ تخلیق مختلف مراحل میں واقع ہوئی۔ قرآن میں انسان کی خلقت کو پودے کے اُگنے سے بھی تشبیہ دی گئی ہے:

وَاللَّهُ أَنبَتَكُم مِّنَ الْأَرْضِ نَبَاتًا

''اور اللہ نے تمہیں خاص طرح زمین سے اگایا ہے۔'' (نوح: ۱۷)

اِرتقاء کو بھی مسلمان مختلف انداز سے دیکھتے ہیں۔ جیسے بعض کے نزدیک مکمل طور پر اِرتقاء ہوا جس میں آدم علیہ اسلام بھی ارتقاء کے بعد ہی اس طرح سے آئے لیکن اس میں اللہ کا تصرف تھا جب اللہ نے خصوصی طور پر ان کو اپنے ہاتھوں سے بنایا یہ استعارہ ہے خدا کی خصوصی رعایت و عنایت کا) اور اسی سبب سے ہماری انسانی سپیشیز یعنی ہوموسپینز (homo sapiens) کے آنے سے عقل و شعور کی تبدیلی آئی جو پہلے کسی اور میں نہیں تھی جیسے نی اینڈر تھال (Neanderthal) یا ہوموایریکٹس (Homo Erectus) وغیرہ میں۔ ویسے بھی انسانوں کے ڈی این اے میں دو فیصد نیاینڈر تھال (Neanderthal) ڈی این اے بھی شامل ہے۔

جہاں تک فلسفی لحاظ سے دیکھا جائے، تو ملاصدرا علیہ الرحمہ کا حرکت جوہریہ کا نظریہ اس بات کی اجازت دیتا ہے کہ ایک جانور ایک صورت سے دوسری صورت اختیار کر لے اور یہ بات محال نہیں کہ ایک جاندار ارتقاء کرتے کرتے انسان بن جائے، جیسا کہ ابن سینا کی کتاب الشفاء میں حیوانات پر گفتگو کے درمیان و spontaneous human generation کو

مانتے ہیں، کہ انسان یک دم وجود میں آ سکتا ہے کچھ حوادث کے بعد بجائے ارتقاء کے ذریعے سے ، اور یہ بات بھی عقلا محال نہیں ہے کیونکہ اس میں بھی منطق کے قواعد نہیں ٹوٹتے، کیونکہ وہ سابقہ مادے سے ہی وجود میں آ رہا ہے، خصوصاً زمین سے۔ لہٰذا باقی انسانوں کو ارتقاء کا نتیجہ مان کر بھی انسان کو استثنائی مخلوق مانا جا سکتا ہے فلسفی لحاظ سے جیسا کہ بعض حکماء مانتے آئے ہیں، اور جیسا کہ حی بن یقطان کی داستان میں بھی ذکر ہوا ہے، یہ سب عقلاً ممکن ہے اور اس نظریہ کو اپنانا ارتقاء کی مکمل نفی بھی نہیں ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ ارتقاء اور اسلام میں تضاد نہیں ہے۔ ہاں بعض لوگوں نے خود سے تضاد پیدا کیا ہے اپنے فہم کو قرآن پر مسلط کر کے، اور مسیحی اور دیگر فرسودہ تکوین کے نظریات کی اقتداء میں۔ ہم جب قرآن کی دیگر آیات کی بھی تاویل کرتے ہیں جسے اللہ کے ہاتھ ہونا چہرہ ہونا تو ادھر کیوں ظاہری اور لٹرل (Literal) معنی لیا جائے۔ بہرکیف، اسلامی نظر میں جن مختلف نظریات کا ہم نے ذکر کیا ارتقاء کی بابت وہ یہ ہیں:

۱۔ آدم علیہ السلام سے قبل اوادم کا ہونا۔

۲۔ تمام جانوروں کا ارتقاء ہونا مگر آدم علیہ السلام کا ایک معجزہ ہونا۔

۳۔ آدم علیہ اسلام کا ارتقاء کر کے اس قابل بننا کہ اب اللہ ان کو زمین پر اپنا خلیفہ بنا سکے، اور اللہ کا یہ ذمہ داری سونپنا۔

۴۔ آدم علیہ السلام کو اللہ کا مختلف بشروں سے انتخاب کرنا جو پہلے سے موجود تھے وغیرہ۔ ہم سمجھتے ہیں کہ یہ تمام آراء جائز ہیں اور اپنے اپنے دلائل رکھتے ہیں، البتہ ارتقاء کا مکمل انکار ممکن نہیں ہے، کیونکہ ارتقاء تو ہر چیز میں ہوتا ہے اور ہر چیز اپنے ماحول کے مطابق ایڈ جسٹ کرتی ہے۔ مسلمان علماء میں مختلف افراد مثلاً جاحظ، ابن خلدون وغیرہ نے بھی اس موضوع پر کلام کیا ہے اور پہلے مغرب میں ارتقاء کو محمدی نظریہ ارتقاء کہا جاتا تھا۔ جاحظ نے کتاب الحیوان میں، خواجہ نصیر الدین طوسی نے اپنی کتب میں، دمیری نے حیات الحیوان الکبری میں، ابن خلدون نے تاریخ

میں، اخوان الصفا نے رسائل میں اور دیگر افراد نے ارتقاء کو بھرپور طریقے سے بیان کیا ہے اور قبول کیا ہے۔

ہم آقائے سید بہشتی کا کلام ان کی فلسفہ دین کی کتاب سے بیان کرتے ہیں جو کہ وہ اپنی تکامل یعنی ارتقاء کی گفتگو کے دوران ذکر کرتے ہیں:

مهمتر آنکه پیدایش بشر بر مبنای اصول تکامل و از نسل جانوران پیش از خود بخودی خود هیچ گونه منافاتی با اصول ادیان آسمانی بخصوص اعتقاد به آفریدگار دانا و توانای جهان ندارد. ما بارها در کتابهای تعلیمات دینی این اصل را یادآوری کرده ایم که خدا بخصوص آنگونه که در قرآن از آن سخن می رود - آفریدگار و مدبر طبیعت است. بنابراین نظام متقن طبیعت آیتی از آیات و نشانه ای از نشانه های اوست، نه واقعیتی در برابر او و نفی کننده او و همه این تلاشها و یا مشاجرات علمی برای شناختن نظام واقعی طبیعت است.

زیادہ اہم یہ ہے کہ بشر کی پیدائش کا ارتقاء کے بنا پر اور اس کا خود بخود گذشتہ جانوروں سے وجود میں آنا، آسمانی ادیان کے اصولوں سے، خصوصاً ایک حکیم و قادر خالق کے اعتقاد سے متضاد نہیں۔ ہم نے بارہا تعلیمات دینی کی کتب میں اس بنیاد کی یاددہانی کی ہے کہ خدا، خصوصاً جیسا کہ قرآن میں اس کے بارے میں بات کی گئی ہے، ایک قدرت کا خالق و مدبر ہے۔ اس بناء پر، ایک کامل نظام قدرت اس کی آیات میں سے ایک آیت اور نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے، نہ کہ ایک حقیقت جو اس کے برابر ہو یا اس کی نفی کرتی ہو۔ اور یہ سب کوششیں اور علمی اَبحاث قدرت کے حقیقی نظام کو جاننے کے لیے ہیں۔

❁ --- ❁ --- ❁